پندرہ روزہ

علیگ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

• علیگ میں چھپنے والے تمام مواد کے لئے ادارہ ذمہ دار ہے۔
• ہر مہینہ کی پانچ اور بیس کو شائع ہوتا ہے۔

ششماہی ایک روپیہ
فی پرچہ ۱۲ نئے پیسے

دوسرا سال جلد ۲	۲۰ اگست ۱۹۵۷ء	نمبر ۳

آزادی کے دس سال

پندرہ اگست کو ہم نے آزادی کی دسویں سالگرہ منائی۔

آزادی کے ان دس سالوں میں ہماری قومی حکومت نے جدید ہندوستان کی تعمیر کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ اس عرصہ میں ہم نے اندرونی طور پر اور بیرونی حیثیت سے قومی سطح پر جو امتیاز حاصل کر لیا ہے وہ ہمارے لئے باعث فخر ہے۔ ہمارا پہلا پنجسالہ پلان امید سے زیادہ کامیاب ہوا ہے۔ اور دوسرا کامیابی کے راستہ پر گامزن ہے۔ بجلی اور آبپاشی کی اسکیموں کا ملک میں ایک سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ بڑے بڑے دیو پیکر بند دریا کے کھلے اور ڈھکے خزانوں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ سڑکوں ریلوں اور ذرائع آمد و رفت کا ملک میں ایک جال بچھ گیا ہے۔ دیہاتوں کی ترقی کے لئے کمیونٹی پروجکٹس چل رہے ہیں۔ ریلوں کے ڈبوں انجنوں اور پانی کے جہازوں کے عظیم الشان کارخانے شب و روز تعمیر میں معروف ہیں۔ ہسٹیل پلانٹس ایک نئے صنعتی انقلاب کے دروازہ پر دستک دے رہے ہیں۔ اعشاری سکوں کا اجراء تجارت کی کایا پلٹنے میں محو ہے۔ ریاستیں نئی طرح سے تنظیم پا رہی ہیں۔ غرض ہماری قوم کا ایک بڑا حصہ دنیا کی حسین ترین سماج کی تخلیق میں معروف ہے۔

بین الاقوامی اسٹیج پر کوئی اہم ترین مسئلہ ہماری مداخلت نہیں، ثالثی کے بغیر حل نہیں ہو پاتا۔ ہم سرد جنگ کو سرد موت بخشنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے ہیں۔ دنیا کے امن کی سلامتی کے لئے سب سے بڑا علم اس وقت ہمارے ہی ہاتھوں میں ہے۔ —— ہماری رائے میں جو وزن اور وقار ہے وہ بڑی طاقتوں کے لئے باعث حسد ہے۔ ہماری معمولی سی تنقید دنیا کی حکومتوں کے ایوانوں میں کھلبلی ڈال دیتی ہے اور اخباروں کے کالم کے کالم سیاہ ہو جاتے ہیں۔

لیکن دراصل اگر دیکھا جائے تو ذہنی اور فکری حیثیت سے ہمارے عوام ابھی تک وہیں ہیں، جہاں انگریز نے لا کر چھوڑ دیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو ابھی تک نہیں سمجھ پائے ہیں۔ ہم معمولی معمولی باتوں پر اب بھی آپس میں الجھ پڑتے ہیں۔ ہم اب بھی ہندو اور

جشن کا دن ہے

(فیض احمد فیض)

جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے
صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے

طرب کی بزم ہے بدلو دلوں کے پیراہن
جگر کے چاک سلاؤ کہ جشن کا دن ہے

تنک مزاج ہے ساقی نہ رنگ مے دیکھو
بھرے جو شیشہ چڑھاؤ کہ جشن کا دن ہے

تمیز رہبر و رہزن کرو نہ آج کے دن
ہر اک سے ہاتھ ملاؤ کہ جشن کا دن ہے

بہت عزیز ہو لیکن شکستہ دل یارو
تم آج یاد نہ آؤ کہ جشن کا دن ہے

وہ شورش غم دل جس کی لے نہیں کوئی
غزل کی دھن میں سناؤ کہ جشن کا دن ہے

مسلمان، سکھ اور عیسائی کے انداز پر سوچتے ہیں۔ انچوڑ اور خلا کے فرق پر ذرا میں خون کی ہولی کھیلنے لگ جاتے ہیں، ہم کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ہم سب میں ایک سب سے بڑی مشترک قدر یہ ہے کہ ہم سب انسان ہیں اور تمام انسان پوری انسانیت کے شکم میں ہی سکھی رہ سکتے ہیں۔

ہماری حکومت نام نہاد سیکولرزم کی دلدادہ ہے جو صرف آئین کے صفحات میں محفوظ ہے، اس نے ابھی تک اسے عملی دنیا میں کہیں نہیں برتا ہے۔ ہمارے دیس میں اقلیتیں اب بھی غیر محفوظ ہیں، ان کا مفاد اب بھی اکثریت کے مفاد پر قربان کیا جاتا ہے۔ اب بھی پنجاب میں سکھوں کو فرقہ پرست کہا جاتا ہے۔ اور وہیں فرقہ پرست ہندی کے حامیوں کو شہ دی جاتی ہے۔ اور کوئی سنجیدہ قائد اس پر اظہار مذمت بھی نہیں کرتا۔ کانگریس جو اس ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی ہے اس افتراق طرازی میں سب سے آگے ہے۔ اس نے کبھی کوشش نہیں کی کہ ان باہم گر لڑنے والے مختلف گروہوں میں مصالحت، اتحاد اور اتفاق کی قدریں تلاش کرے۔ اور ان کے پرچار میں تن من دھن سے لگ جائے۔ اس نے کبھی یہ بھی نہیں چاہا کہ خود اس کے اپنے شعور میں فرقہ پرستی کا جو زہر گھلا ہوا ہے اسے کسی طرح نکال پھینکے، بلکہ اکثر موقعوں پر خود اس نے ایک ترین فرقہ پرستی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی دلیل میں یوپی کانگریس کی مثال کافی ہے۔

تب پھر ـــــ اس روش میں ہمارا بین الاقوامی وقار کچھ ہوا میں معلق نظر آتا ہے۔ جب خود اپنے ملک میں ایک فرقہ دوسرے فرقے سے، ایک خیال دوسرے خیال سے، ایک نظریہ دوسرے نظریے سے صرف متضاد ہی نہیں برسرِپیکار ہو۔ تو کچھ اچھا نہیں لگتا کہ ہم دوسری قوموں کو پنچ شیل کی تعلیم دیتے پھریں ـــــ جب خود اپنے دیس میں صدہا مسائل الجھے پڑے ہیں۔ تو یہ بات جچتی نہیں کہ ہم مصر و روما کے مسائل میں سر کھپائیں۔ ہم وقت سے پہلے بڑے بن گئے ہیں۔ اور یہ بڑائی جس کے ہم کسی طرح مستحق نہیں تھے، ہمارے ناتواں شانوں پر ایک بھاری بوجھ ہے جو ہماری قوت عمل کو بری طرح مجروح کر رہا ہے۔ بین الاقوامی میدان میں ہماری ساکھ اور ہمارا وقار ایک عام ہندوستانی کے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتا، اس کی نظر نزدیک کی دنیا پر پڑتی ہے وہ سوچتا ہے کہ خود اس کے اپنے مسائل کے حل کرنے میں پنڈت جی اور ان کی حکومت نے کیا کیا ہے؟ وہ ہماری ترقی کا اندازہ اس بات سے لگاتا ہے کہ خود اس کی زندگی کتنی سکھی ہو گئی ہے اور جب وہ اس طرح سوچتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس کی زندگی پہلے سے کم دکھی نہیں ہے وہ اب بھی کم و بیش اس قسم کے مسائل سے دوچار ہے۔ جن سے پہلے تھا۔ اب بھی بھوک اور بے روزگاری اس کے لئے پہلے کی طرح ایک چیلنج ہے۔ اب بھی بیکاروں کی آبادی میں ہر سال دس لاکھ ۸۰ ہزار کا اضافہ ہو جاتا ہے اور اسی لئے انبساط اور امنگ کی وہ لہر جو آزاد شہری کے رگ و پے میں دوڑنی چاہئے اس میں نہیں آتی۔ اور آزادی کے زمزمے، لال اور پیلی جھنڈیاں اور چراغاں اس کے بے نور دل میں کوئی گدگدی نہیں پیدا کر پاتے۔ پھر کچھ ایسا لگتا ہے کہ ہماری یہ ساری ترقی اور چمک دمک محض اوپری ہے اور ہمارے سماج کے بگڑے ناسور ابھی مندمل نہیں ہو پائے ہیں۔ آزادی کی نیلم پری سلطنت کے ایوانوں میں ہو جاتی ہے، یہ سڑکوں، کھیتوں اور کھلیانوں میں نہیں نکلتی۔ اس کا

زیر لب

ہماری یونیورسٹی میں تقریباً ہر شعبہ کے داخلے ختم ہو چکے ہیں، لیکن سائنس فیکلٹی کے شعبۂ فزکس میں ایم۔ ایس۔ سی پریویس میں، ابھی تک پچیس سیٹس میں سے صرف چھ، سات داخلے ہوئے ہیں، اس میں طلباء کی کوتاہی کو دخل نہیں بلکہ ڈپارٹمنٹ کی سیاست اس کی ذمہ دار ہے۔ ابھی تک باقی امیدواروں کے نام بھی منتخب نہیں ہو سکے ہیں۔ اپنی یونیورسٹی کے پرانے طلباء اور باہر کے امیدوار سب ہی روزانہ فزکس ڈپارٹمنٹ اور رجسٹرار آفس کے چکر لگاتے ہیں اور دوپہر کو مایوس کمرہ پر لوٹ آتے ہیں۔

یونیورسٹی کے کھلنے کے چند یوم بعد ہی فزکس ڈپارٹمنٹ کے چیرمین پروفیسر گل نے تقریباً ڈیڑھ سو درخواستوں میں سے پچیس طلباء کے نام چن کر ایک لسٹ تیار کی اور رجسٹرار آفس کو بھیج دی، یہ سب امیدوار فرسٹ کلاس تھے اور سب کے سب باہر کے تھے۔ اپنی یونیورسٹی کا ایک بھی امیدوار اس لسٹ میں جگہ نہ پا سکا۔

معلوم ہوا ہے کہ منتخب شدہ طلباء جن کو گل صاحب نے بذریعہ تار اطلاع دیدی تھی مع ساز و سامان کے داخلہ کے لئے علی گڑھ پہنچے۔ تو رجسٹرار نے ان میں سے بعض کو داخلہ دینے سے مجبوری ظاہر کی ـــــ یہ لوگ پنجاب اور کیرالا سے آئے تھے، جہاں بی۔ ایس۔ سی کا امتحان صرف دو یا ایک مضمون لے کر بھی پاس کیا جا سکتا ہے اس کے برخلاف علی گڑھ یونیورسٹی میں تین سائنسی مضامین کے علاوہ تین لازمی مضامین میں بھی امتحان دینا پڑتا ہے۔ چونکہ یہ طالب علم اپنی درسگاہوں میں بھی بغیر ایک اور امتحان پاس کئے ہوئے ایم۔ ایس۔ سی میں داخلہ کے اہل نہیں اس لئے رجسٹرار نے ان کو اپنی یونیورسٹی میں داخلہ دینے کے حق سے بھی محروم کر دیا ـــــ سنا گیا ہے کہ داخلہ کی ہدایات کے ساتھ رجسٹرار نے مندرجہ بالا ہدایت بھی ہر چیرمین کو بھیج دی گئی تھی لیکن شاید گل صاحب نے اس ہدایت کو اہم نہیں سمجھا اور اس سے آزاد ہو کر لڑکوں کو منتخب کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد رجسٹرار اور گل صاحب کے درمیان کافی کھنچاؤ پیدا ہو گیا۔ اپنی درسگاہ کے طالب علم پریشان ہوتے رہے۔ داخلوں کی تاریخ ختم ہو گئی، ہوسٹل نئے داخلوں سے بھر گئے۔ وارڈن حضرات نے ان کو ہوسٹلوں سے نکل جانے کے آرڈر دیدیئے اس لئے کہ ابھی تک ان کو داخلہ نہ مل سکا تھا اور ان کی جگہیں پُر ہو گئی تھیں۔ ۱۰ راگست کو اکیڈمک کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ ان خالی جگہوں کو اپنے یونیورسٹی کے سیکنڈ ڈویژن طلباء سے پُر کیا جائے اور گل صاحب کو فیصلہ ماننا پڑا۔ اب انہوں نے اپنے پرانے طلباء کے نام چن کر رجسٹرار کو بھیجے۔ اور بالآخر وہی کرنا پڑا جو انھیں پہلے کرنا چاہئے تھا۔ لیکن کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ! اب ان منتخب شدہ طلباء کی جیب میں مال کہاں جو "قمار خانۂ عشق" میں داخل ہوں، ہفتوں کی بھاگ دوڑ میں سارا اثاثہ ختم ہو چکا ہے۔ اور داخلہ کی رقم ایک مسئلہ بن گئی ہے، ہوسٹل پُر ہو چکے ہیں اور اب نئے ہوسٹلوں میں ٹھوکریں کھانا پڑیں گی۔ تعلیمی اداروں میں استادوں کا طالب علموں سے ایسا برتاؤ بڑے دکھ کی بات ہے۔ داخلہ کمیٹی سے ہماری تجویز ہے کہ وہ اس قسم کے قانون بنائے کہ پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز میں ہماری یونیورسٹی کے پرانے طلباء کو داخلے

ڈاکٹر سید عابد حسین



جب وہ کپڑے بدل کر کالج کے لئے تیار ہو گئے تو معلوم ہوا۔

"حضرت باتھ روم میں جا کر پاجامہ سیدھا کر لیجئے"!

"ارے میں نے الٹا پاجامہ پہن لیا ہے؟" وہ ہنسنے لگے۔

یہ خیالات کی ادھیڑ بن میں اسی طرح محو رہتے ہیں، خود الٹا پاجامہ ضرور پہن لیتے ہیں لیکن مشورہ ہمیشہ سیدھا پاجامہ پہننے کا دیتے ہیں، فلسفیانہ استغراق کی کیفیت میں دوا کے بجائے سیاہی پی جاتے ہیں، لیکن اپنے مریضوں کو ہمیشہ دوا ہی پلاتے ہیں، سیاہی کبھی نہیں پلاتے۔

یہ الٹا پاجامہ پہن کر کالج جانے والے سادہ لوح معلم عابد صاحب تھے، جامعہ کے ڈاکٹر سید عابد حسین مشہور و معروف ادیب، مترجم اور جامعہ کے ان چند معماروں میں سے ایک جنہوں نے آج سے تیس سال پہلے اس کی بے غرض اور بے لوث خدمت کرنے کا عہد کیا تھا۔ انہوں نے یہ حلف اس وقت اٹھایا تھا جب وہ ڈاکٹر صاحب کی طرح جرمنی سے پی ایچ ڈی کر کے لوٹے تھے، اور مٹھی بھر پڑھوں لکھوں کے اس دیس میں ایک شاندار مستقبل انہیں خوش آمدید کہنے کو تیار تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے علم و فن کو بیچ کر کوئی قصر نہیں خریدا۔ انجہاری کی طرح گھر بنانا پسند کیا اور اس میں زندگی بتا دی۔

علم و ادب سے انہیں جو شغف ہے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں، اردو میں ترجمہ کے فن کو انہوں نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اسے میکانکی عمل کے درجہ سے نکال کر تخلیق کا مرتبہ عطا کیا۔ عبدالحق کی شہرۂ آفاق اردو ڈکشنری ان کی درپردہ کوششوں کی رہین منت ہے۔ جرمن زبان میں ان کے درس کے وسیلے سے اس زبان کا صالح ادب ہم تک پہنچا۔ ان کے فلسفیانہ مطالعوں نے ہمیں کانٹ کی معرکۃ الآرا تصنیف "تنقید عقل محض" سے روشناس کیا۔ ادب کے شستہ اور سنجیدہ ذوق نے "مضامین عابد" کا ایک خوبصورت مجموعہ پیش کیا جو طنز و مزاح کے علاوہ تحقیق و تنقید کا ایک مرقع ہے۔ خصوصاً اقبال کی خودی پر ان کا مضمون اس فلسفہ کی کامیاب تصویر کشی ہے۔ پھر مزاح نگاری کے کچھ نادر نمونے "نئی روشنی" کے کالموں میں نظر آئے جو عابد صاحب کی ادارت سے جامعہ سے نکلتا تھا۔ اور ہر خوبصورت چیز کی طرح جلد ہی غائب ہو گیا، لیکن ان کے کام لطیف اب بھی بہتوں کو یاد ہیں جیسے سب چاند ماری کا نشانہ بنائے جاتے تھے۔ ہندوستانی قومی تہذیب پر ان کی نظر اور مطالعہ "قومی تہذیب کا مسئلہ" میں نمودار ہوا جو اس موضوع پر ایک صحیفہ کی حیثیت رکھتی ہے جو قوم پر عابد صاحب کی ایک خوبصورت پیش کش ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اسے حکومت نے سال کی بہترین اردو کتاب کے انعام سے نوازا اور اس میں عابد صاحب کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی کئی ہزار سال کی بہترین تہذیبی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس میں گوناگوں کثرت کے باوجود وحدت کا جو ایک رشتہ موجود ہے وہ ارباب حکومت کے جبر و تشدد سے نہیں بلکہ عارفوں کے وجدان سے، فلسفیوں کی فکر سے، زاہدوں کی ریاضت سے اور فن کاروں کے تخیل سے پیدا ہوا ہے اور یہی سادھن ہیں جن کے ذریعہ سے اسے زیادہ وسیع، مضبوط اور پائدار بنایا جا سکتا ہے۔" انہوں نے کثرت میں وحدت کا ایک باریک رشتہ تلاش کیا ہے۔ معلوم نہیں ان کی تھیسس کو ہم کس کروٹ بٹھائیں۔

اور اب جب تعلیم علم کا یہ شہریار جامعہ سے علی گڑھ کی طرف ہجرت کر رہا ہے تو ہم منتظر ہیں کہ دیکھیں یہ یہاں اپنے فن کے کیا جوہر دکھاتا ہے۔

ممکن ہے ان کی علمی کاوشوں پر کوئی سبقت لے جائے لیکن جامعہ کا حال نہیں تو اس کا ماضی ضرور ان کی شخصیت کی سادگی، خلوص اور ایثار کا لوہا منواتا رہے گا۔ عابد صاحب نے جامعہ کی تاریخ بنائی ہے۔ انہوں نے ایک نسل تیار کی ہے۔ ایک تہذیب کی طرح ڈالی ہے۔ جامعہ اس تاریخ کا ایک مرقع ہے۔ یہ تہذیب اور تاریخ کاغذ کے صفحات یا آرٹ گیلریوں میں محفوظ نہیں۔ دل و دماغ پر ثبت ہے۔ اس تہذیب کا تماشا کرنے والے سیلانی کو صرف ڈاکٹر صاحب کی رنگا رنگ شخصیت ہی میں گم نہیں ہونا چاہئے۔ اسے ان گمنام لوگوں کے پیراہن چاک کرنے چاہئیں شاید ان کی تزئین میں عابد صاحب کے خون جگر کی آمیزش بھی ہو۔ اس ادارہ کی تعمیر و تہذیب میں کونسا گوشہ ایسا ہوگا جس پر عابد صاحب کی چھاپ نہیں۔ اس کے در و دیوار اس کے طلبا، بام و در و دیوار اس کے تصور کے رنگ محل، ہر جگہ عابد صاحب کا دل دھڑکتا نظر آئے گا۔ اور پھر بھی عابد صاحب اس کے معمار اعظم کے سامنے چھپ جاتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر صاحب کی طرح چمک کے کبھی دکھل سکے وہ ایک ہند کی سی دیپ ہیں جس کے دل میں وحی نازل ہوتی ہے۔ ان کی زبان میں لکنت ہے جس پر سب کچھ عیاں ہو جاتا ہے۔ پھر وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں صرف کر سکتے ہیں۔ انہوں نے بھی ساری زندگی خاموشی سے موتی پروئے ہیں۔ اس مالا کو لیکر بازار میں کبھی نہیں نکلے۔ وہ ہمیشہ انجانے رہنماؤں کی طرح تخلیق کا عمل خاموشی سے کرتے رہے ہیں — گندھی ہوئی گیلی مٹی سے ذرہ ذرہ کر کے مٹی فراہم کرنا، دیوار کے کسی گوشہ میں اس نفاست، احتیاط اور صبر سے اسے پھیلانا گویا کوئی فنکار سنگ پارہ تراش رہا ہے، کسی ہرے بھرے درخت کے سایہ میں تنے ہوئے کسی کڑی کے تار کو توڑ کر ایک سبز زندہ شے کو دبوچ کے لے اڑنا، اس سبز زندہ شے کو گھر میں رکھ کر اس کا منہ بند کرنا اور پھر یہ انتظار کھینچنا کہ کب اس مقبرہ کا گھر یا سے ایک زندہ کردار ایک نئی زندگی ابھرتی ہے — عملی اگر یہ نہیں تو پھر اور کیا ہے۔ معلم گیلی گندھی ہوئی مٹی میں سے ایک پتلا تراشتا ہے اس میں اپنے علم

(بقیہ صفحہ ۱۶ پر)

جیسا سماج ہم ہندوستان میں قائم کرنا چاہتے ہیں اُسے پہلے ہم مسلم ...
میری نسل کے لوگوں سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ اس نے پوری نہیں کیں"

... آزادی کے موقع پر زیدی صاحب کے ارشادات

... اگست۔ "علی گڑھ میں طلبا ملک کے کونے کونے سے آتے ہیں۔ جو مختلف مذہبوں اور ... سے تعلق رکھتے ہیں اور مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ اس طرح علی گڑھ ہندوستان کا منی ایچر (MINIATURE) ہے۔ جیسا سماج ہم ہندوستان میں قائم کرنا چاہتے ہیں اسے ہم مسلم یونیورسٹی میں قائم کریں گے۔" یہ تھے وہ الفاظ جو کرنل بشیر حسین زیدی شیخ الجامعہ ... یوم آزادی کی صبح کو وکٹوریہ گیٹ پر قومی پرچم لہراتے ہوئے فرمائے۔

زیدی صاحب نے طلبا اور یونیورسٹی اسٹاف کے ایک بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ... ہم کو آزادی حاصل کئے ہوئے دس برس گزر چکے ہیں ہندوستان نے اس عرصہ میں جو ... کی ہے اس سے ہر شخص واقف ہے۔ ہندوستان کو دوسرے ممالک عزت کی نگاہ سے دیکھتے ... اور جب کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا ہے تو ہندوستان کی رائے معلوم کرنے کے لئے دنیا منتظر ... ہے۔" انہوں نے قوم کی کوتاہیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے یہاں مذاہب اور فرقوں میں ... امتیاز ہوتا ہے اور ابھی تک سچا اتحاد پیدا نہیں ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ "وہ چیزیں جو ... ورثہ میں ملی ہیں ان پر نظر ڈالنی چاہئے۔ ہمیں ان چیزوں پر نظر رکھنی چاہئے جو ہمیں ایک کرتی ... اور ان پر جو ہم میں اختلاف پیدا کرتی ہیں۔" زیدی صاحب نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ... ہماری قوم کی بدنصیبی ہے کہ ہم لوگ محنت نہیں کرتے ہیں میری نسل کے لوگوں سے جو امیدیں وابستہ ... انہوں نے انہیں پورا نہیں کیا۔ اب تو سب امیدیں آپ سے وابستہ ہیں اگر آپ اپنے سب کام ... خوش اسلوبی سے انجام دیں گے تو یہ ہندوستان کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔" شب میں ... یوم آزادی کے سلسلہ میں تمام اہم عمارتوں پر چراغاں بھی کیا گیا۔

... سال کے نئے کپتان

... سال رواں کے نئے کپتانوں کا اعلان کر دیا گیا ہے۔
... ہاکی۔ مسٹر نعمان۔ کرکٹ۔ ضیاء الحق۔ فٹ بال۔ مکرم علی۔ ٹینس۔ اسلم قدیر۔ تیراکی۔ مسلم صدیقی۔ ... سواری۔ ہدایت اللہ۔ جمنیزیم۔ محمد شفیق۔ جنرل ایتھلیٹکس۔ اسحاق۔ ہاکی۔
... ادارہ علیگ نئے کپتانوں کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

... انٹر یونیورسٹی

... معلوم ہوا ہے کہ امسال یوپی انٹر یونیورسٹی کھیلوں کے مقابلے علی گڑھ میں ہوں گے۔

... میڈیکل کالج

... معلوم ہوا ہے کہ آخر جون میں شیخ الجامعہ نے وزیر صحت صوبہ یوپی۔ شری ٹھاکر ... سے نینی تال میں بسلسلہ قیام میڈیکل کالج ملاقات کی اور مسٹر ای ایم بھاٹیہ اسسٹنٹ میڈیکل ... سیکرٹری سے بھی اس موضوع پر تفصیلی گفتگو فرمائی۔ آنریبل منسٹر نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے ... کمیٹی زیر صدارت ڈاکٹر جواہر لعل ڈپٹی ... شعبہ صحت عامہ جلد مقرر کرنے کا خیال ظاہر ... جو یونیورسٹی میڈیکل کالج کمیٹی سے تبادلہ خیال کرکے بہت جلد کسی نتیجہ پر پہنچے گی۔

بقیہ صفحہ ۲ کالم ۲ سے۔

۱۸۵۷ء کی اہمیت

اور ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑتے لڑتے جان بحق تسلیم ہوگئے۔

لیکن عوام کا ردعمل بھی قابل ذکر ہے۔ اس وقت کی ایک سنگین حقیقت یہ ہے کہ لوگ بھوکوں مر رہے تھے۔ سپاہیوں کی تقسیم اس حقیقت کا ایک اظہار ہے۔ حصول آزادی کے علاوہ بھوک اور مفلسی نے سپاہیوں اور عوام کو متحد کر دیا تھا۔ ان ناساعد حالات میں جب ناکامی یقینی تھی تانتیہ ٹوپی اپنے سواروں کو ۳۰ روپیہ ماہانہ اور پیادوں کو ایک روپیہ یا ... دیکر مطمئن تھا۔ سر سید احمد خاں نے لکھا ہے کہ بجنور میں روہیلوں کا سردار محمود خاں اپنے فوجیوں کی ماہانہ تنخواہ ہندو چودھریوں کو لوٹ لوٹ کر ادا کیا کرتا تھا۔ جنہوں نے پچھلے لوگوں کو پانچ پانچ بیسہ روز پر لڑنے کو بلا لیا۔ اور پھر لکھنؤ میں صرف دو وقت کے کھانے پر ... لوگ ان کی طرف سے لڑتے رہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے لئے بڑے اچھے مواقع تھے اگر اس کے پیچھے کوئی مستحکم آئیڈیالوجی ہوتی۔ ماؤزے تنگ نے ہمارے اپنے زمانہ میں محدود وسائل سے اس میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔ لیکن ماؤ کی ترقی پسند تعمیری آئیڈیالوجی ۱۸۵۷ء میں ممکن نہ تھی۔ اور ۱۸۵۷ء کی آئیڈیالوجی اور اس کے رجعت پسندانہ مقاصد میں تو کامیابی بھی تباہی کے مترادف ہوتی ـــــــ اور اس طرح ہندوستان کی آزادی ۹۰ سال کے لئے ملتوی ہو ... اور ان ۹۰ سالوں میں انگریزوں کے زیر سایہ نہیں۔ بلکہ اس کے آزاد طور پر ایک نیا ہندوستان تخلیق ہوتا رہا ہے۔ یہ نیا ہندوستان مہاتما جی کا ہندوستان ہے جو ۱۸۵۷ء کے ہندوستان سے بھی پرے ہے۔ ہم نے پچھلی تین ہولناک نسلوں میں انگریزوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ہم اس کے لئے ان کے ممنون ہیں۔ لیکن پھر بھی ہمارے بنیادی تصورات برطانوی نہیں۔ نہ مہاتما جی کی اہنسا برطانوی ہے نہ خارجہ پالیسی نہ ہمارے پنچ شیل۔ ہم کے لئے ہم اپنے عظیم رہنما کے مرہون منت ہیں جس نے ہمیں انگریزوں اور دنیا کی ساری قوموں سے دوستانہ تعلقات استوار رکھنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔

گاندھی جی کے ایک نامور پیرو کے لئے ۱۸۵۷ء کی تحریک ایک قومی انقلاب ہے یہ ایک خواب پریشاں بھی ہے۔ ایک سبق بھی ہے کہ کب ہمیں انقلاب سے بچنا چاہئے ـــــــ تاہم ۱۸۵۷ء کا انقلاب چین۔ کے باکسر اور تائی پنگ کے انقلابیوں کی طرح، غالباً تاریخ کے منطق میں بہت ضروری بھی تھا۔ افراد کی طرح قومیں بھی ٹھوکریں کھا کر ہی صحیح راستہ کا پتہ چلاتی ہیں۔ اس انقلاب میں جو کچھ اچھا ہے ہمیں اس کی یاد .... اور اس کی قدر کرنی چاہئے۔

انگریزی زبان میں نیا اخبار

عنقریب یونیورسٹی ٹائمس کے نام سے انگریزی کا ایک پندرہ روزہ اخبار سید ظفر امام کی ایڈیٹرشپ میں نکلنے والا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ اخبار ایک اچھے انگریزی اخبار کی کمی کو پورا کرے گا۔

یونیورسٹی میں قائم کریں گے"

بوٹنگ کلب

یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ یونیورسٹی میں بوٹنگ کلب کا قیام عمل میں آگیا ہے پرانے قلعہ کی کھائی کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ چار کشتیاں اب تک خریدی جا چکی ہیں، جو مختلف رنگ کی ہوں گی اور ہر رنگ کسی ایک ہال کی نمائندگی کرے گا۔ بوٹنگ کلب کے قیام میں زیدی صاحب کی کوششیں قابل تحسین ہیں۔

یونیورسٹی میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ کا صد سالہ جشن سالگرہ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام ۱۶ راگست کو صبح ۹ بجے ۱۸۵۷ء کی صد سالہ سالگرہ کے سلسلہ میں یونین ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت شیخ ابی سعد نے کی۔

ڈاکٹر تاراچند نے ہال کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ۱۸۵۷ کی کشمکش نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نیا باب کھولا اور قومی بیداری کو جنم دیا۔ جو در اصل ۱۹۵۰ء میں حصول آزادی کے بعد ہندوستان کے نئے جمہوری آئین کے قیام کا موجب بنی۔ اس تحریک نے ایک ایسی آزاد مشترکہ ریاست کی بنیادیں استوار کیں جس میں فرقہ واریت اور صوبہ پرستی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی اور اس طرح ہندوستان میں ایک سیکولر جمہوریت کے لئے ماحول پیدا کیا۔ حبیب صاحب نے اس تحریک کی اہمیت پر ایک مدلل اور پُر مغز تقریر کی اور اس کے سماجی پس منظر پر روشنی ڈالی۔ سرور صاحب نے بھی اس موضوع پر ایک تقریر کی۔

شیخ ابی سعد کی تقریر کے بعد یہ جلسہ برخاست ہوا، جس میں انہوں نے مورخوں اور علماء سے یہ درخواست کی کہ وہ ہندوستان کے حصول آزادی کے سلسلہ میں مختلف سیاسی تحریکوں کا ایک نئے طرز سے جائزہ لیں۔ اپنے ہم وطنوں سے انہوں نے کہا کہ تاریخ کے صرف صحت مند عناصر کو اپنائیے۔

رشید شروانی واپس آگئے

'دوست' کے مدیر رشید شروانی عالمی یوتھ فیسٹیول میں شرکت کے بعد ماسکو سے واپس آگئے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ رشید صاحب نے امسال اسلامک اسٹڈیز (ایم اے پریویس) میں داخلہ بھی لے لیا ہے۔

بقیہ ص کالم ۔۔ آزادی کے دس سال

تیض ابھی عام نہیں ہوا ہے۔ پھر اس ماحول میں محض ایک روز آزادی کی یادگار منانے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کو روز روز یاد کیجئے، اس کی قیمت پہچانئے اور اس کے ادا کرنے کے لئے تیار رہیے۔ اور ہر روز اپنے اعمال سے اس کے مستحق ٹھہریئے۔ آج یہ عزم کیجئے کہ ہمیں اپنے ملک کو ایک ایسا ملک بنانا ہے جہاں لوگ الگ الگ مشترکہ خاندانوں کی طرح ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہیں۔ ہمیں فرقہ واریت کو ہمیشہ کے لئے دفن کرنا ہے۔ ہمارا ہندوستان پھر ایک ہے۔ جو ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کا ملا جلا ورثہ ہے۔ ہمیں اس ورثہ کو سینے سے لگانا ہے۔ آزادی کی صحیح یادگار صرف اسی طرح منائی جا سکتی ہے کہ ہم اپنے قوت کا ایک ایک شمہ ان کاموں میں خوشی خوشی صرف کر دیں۔

این آر ایس کلب ۱ے میں جنگ آزادی کی صد سالہ سالگرہ

۱۰ راگست کی شام کو ۵ بجے این آر ایس کلب اے میں ہندوستان کی پہلی جنگ … آزادی کی صد سالہ سالگرہ منائی گئی۔ پروگرام ڈاکٹر ستیش چند کی تقریر سے شروع ہوا … جس میں انہوں نے جنگ آزادی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ کنور رفاقت علی خاں نے … ۵۷ پر ایک تقریر کی اور اس کے بعد صدیق الرحمٰن قدوائی نے اس بغاوت عظیم کی اہمیت پر ایک مقالہ پڑھا جسے بہت پسند کیا گیا۔ اشتیاق محمد خاں اور ان کے ساتھیوں نے ایک گیت پیش کیا اور سریش نے دلنواز انداز میں اس پر ایک دھن سنائی۔ بشیر … زیدی نے بہادر شاہ ظفر کی وہ مشہور غزل "کسی کی بن کے عالم ناپائیدار میں" ترنم سے … اس موقع پر کلب کو خوشنما دیتیوں سے بھی آراستہ کیا گیا تھا، اور مہمانوں کی کافی اور ناشتہ … سے تواضع کی گئی۔ پروگرام کی کامیابی کے لئے عمر علی صاحب (انچارج گروپ اے) قابل مبارکباد ہیں۔

بقیہ ص ۔۔ ڈاکٹر سید عابد حسین

تجربہ اور عرفان پیغمبری کی روح پھونکتا ہے۔ لیکن اس تعبیر میں وہ تجربہ وہ عرفان … وہ سلیقہ کیسے پیدا ہو جو ایک نئی اور حسین زندگی کو جنم دے سکے۔ مسلسل … انجباری کی گھڑیاں ہے لیکن جب انجباری کی گھڑیاں کے اندر سے ایک نئی اور زیادہ … حسین انجباری نہیں نکلتی وہ یا تو انجباری کی گھڑیاں نہیں ہے یا پھر اس انجبا… پر وحی نازل نہیں ہوئی ہے۔

(بقیہ ص کالم) اک عرض تمنا ہے……!

طرف سے نالی ایک ایک بالشت اونچی کی جانے لگی۔ تاکہ پانی سڑکوں پر نہ امڈ آئے … مگر دوبارہ پھر لوگوں کو سمجھنے کا وقت آ گیا تھا۔ تو مزدور پھر نالیوں کی منڈیر اونچی … نظر آتے تھے اور اس مد میں کے باوجود سڑکوں پر پانی رہتا تھا۔ ——— خیر تعمیر … کی مہم تو اب ختم ہو گئی ہے مگر سڑکیں اب بھی آب باشی کے وقت آب دستی ہے۔ تعمیرات والے اس حقیقت سے واقف نہیں۔ ع

پانی ہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

ان ناقص نالوں کو کچھ نہ کچھ درست کیا ہی جا سکتا ہے۔ ہمارے وائس چانسلر … کی اصلاحی صلاحیتوں کا تو ایک زمانہ معترف ہے۔ یہ سب باتیں یقیناً ان کی … سے پوشیدہ نہ ہوں گی۔ ہمیں امید رکھنی چاہئے کہ وہ جلد از جلد ان کی طرف توجہ دیں …

اک عرضِ تمنّا ہے.....!

یونیورسٹی کا نیا سیشن گو کہ ایک ماہ قبل شروع ہو چکا ہے مگر غلغلۂ محرم اور جشنِ آزادی کی طویل چھٹیوں کی بنا پر گزشتہ ماہ وہ چہل پہل نظر نہیں آئی جو یونیورسٹی کھلتے ہی دکھائی دینے لگتی ہے۔ اب چونکہ ماحول کی یہ اکتا دینے والی خاموشی کے ختم ہونے کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ اور اقامتی زندگی میں پھر وہی پہلا سا رنگ آ گیا ہے اور وہ تعلق جو اتنے عرصہ تک منقطع رہا پھر قائم ہو گیا ہے۔ اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ علیگ کے قارئین اور یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کے سامنے کچھ قابلِ غور باتیں پیش کریں۔

چھٹیوں بھر ملک میں کفایت شعاری کی مہم کی خبریں سنتے رہے۔ صدر، گورنروں، وزیروں کی تنخواہوں میں کمی کی اطلاعات ملیں۔ غیر ضروری آرام و آسائش اور شان و شکوہ کی چیزوں کے فروخت ہونے کی خبریں سنیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آمدنی کے ذرائع کو وسیع تر کرنے کے لئے بہت سرکاری ملازمین کو برطرف بھی کر دیا گیا ہے ——

مگر جب یونیورسٹی میں آئے تو آتے ہی ایک نئی خوبصورت خوش وضع اور پُر شکوہ موٹر کار دکھائی دی کہ شاید علی گڑھ کی سڑکوں نے بہت کم ایسی کار سے پامال ہونے کا شرف حاصل کیا ہو۔ اب یونیورسٹی کے پاس تین کاریں ہو گئی ہیں۔ ہمارے خیال میں یونیورسٹی کے بجٹ پر یہ نہایت غیر ضروری بار ہے۔ علی گڑھ جیسے شہر میں جہاں ایک چھوٹے سے رقبہ پر پوری یونیورسٹی سمائی ہو یونیورسٹی اور شہر کا برائے نام تعلق ہو تین موٹریں رکھنا محض فضول خرچی ہے۔ پچھلے سال تک صرف دو کاریں تھیں جن میں سے ایک بہت کم نکالی جاتی تھی اور ایک چھوٹی سی کار سے سب کام چل جاتا تھا۔ اس سے بھی چند سال قبل صرف ایک کار تھی اور پھر بھی یونیورسٹی کے کام بخوبی چلتے رہتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اچانک کون سے ایسے مسائل ہمارے سامنے آ گئے جو بغیر تین موٹروں کے حل نہیں ہو سکتے۔ جہاں تک مہمانوں کے شایان شان استقبال اور تواضع کا تعلق ہے وہ اب سے پہلے موٹروں کے بغیر بھی خوش اسلوبی کے ساتھ کیا جاتا رہا کہ علی گڑھ کی ایک مثالی حیثیت ہو گئی۔ قومی ادارے تمام تر قوم کی ملکیت ہوتے ہیں۔ اور ان میں کام کرنے والے قوم کے امین ہوتے ہیں۔ ایک پیسہ بھی خرچ کرنے سے پہلے ہمیں اچھی طرح سوچ لینا چاہئے کہیں ہم امانت میں خیانت تو نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں [illegible] کی موٹر کی بجائے انہیں داموں میں ایک بس خریدی جاتی تو اس سے یونیورسٹی کا ہر اعتبار سے فائدہ ہوتا۔ یونیورسٹی کے بہت سے اساتذہ اور تقریباً سارے کلرک اور دوسرے ملازمین شہر میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ یونیورسٹی کے پاس اپنی ایک بس ہو جو انہیں ان کے گھروں تک پہنچا سکے۔ پھر ہماری یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی طرف سے ہر سال طلبا دہلی، آگرہ اور دوسرے مشہور مقامات پر تعلیمی سفر پر جاتے ہیں۔ جن کے نصف اخراجات یونیورسٹی دیتی ہے اگر یہ روپیہ ریل کے کرایہ پر صرف کرنے کے بجائے بس کے سفر پر خرچ کیا جائے اور اس کے علاوہ طلبا جو سفر کے نصف اخراجات ریل سے جانے میں صرف کرتے ہیں ان سے بھی بہت کم رقم لی جائے تو یونیورسٹی اور طلبا دونوں بے جا اخراجات سے بچیں گے۔ بس کے دام بھی چند سال میں وصول ہو جائیں گے اور وقت بھی بچے گا جو ریل کے اوقات سے بندھ کر ہم آہنگ کرنے میں صرف ہوتا ہے اور اپنی مرضی اور ضروریات کے مطابق متعدد مقامات کی بغیر کسی دقت کے محض ایک ہی TRIP میں سیر کی جا سکے گی۔ ہندوستان کے بہت سے تعلیمی اداروں میں یہ طریقہ رائج ہے اگر یہاں بھی ایسا ہو جائے تو آخر کیا حرج ہے؟

ایک اور بلا جو صرف ہمارے ادارہ پر ہی نہیں پورے ملک پر چھائی ہوئی ہے وہ ہے کنٹریکٹ سسٹم۔ چھوٹی سے چھوٹی پارٹی میں بھی اہتمام ہوگا کہ کسی ٹھیکیدار کا کھانا پکوایا جائے تو وہ ٹھیکے پر۔ یونیورسٹی کا نصاب چھپے گا تو وہ ٹھیکے پر۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے کہ ٹھیکیدار صاحب پہلے اپنا منافع نکال لیتے ہیں اور اس کے بعد پُر خلوص و پُر تکلف دعوت کا انتظام کرتے ہیں۔ اب تو سوشلزم کا دور آ رہا ہے۔ اگر ٹھیکیداری کا قلع قمع نہ ہوا تو کام کیسے چلے گا۔ اس سال وی ایم ہال (V. M. HALL) میں ٹھیکیداری کا طریقہ ختم کیا گیا ہے اور اب وہاں کے کھانے کی مقدار، اقسام، ذائقہ اور انتظام غرضکہ ہر اعتبار سے سرسید کے لفظوں میں مریض کی حالت اور مرض کی نوعیت کے مطابق تبدیلی ہوئی۔ وی ایم ہال کے ارباب حل و عقد مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اور ہمیں یقین ہے کہ دوسرے ہالوں والے بھی اس کامیاب تجربہ سے فائدہ اٹھائیں گے۔

ایک اور بات جس کی طرف سے بے توجہی برتی جا رہی ہے اور وہ یہ کہ یونیورسٹی میں کچھ بھی ہو لیکن یہاں کے رہنے والوں کو اس کی اطلاع نہیں مل پاتی اور اگر ملتی ہے تو بس اُڑتی ہوئی۔ سنتا ہے کہ بوٹنگ کلب بن رہا ہے۔ چھٹیوں سے پہلے سنا تھا کہ یونین کی عمارت میں ضرورتوں کے مطابق ترمیم ہوگی۔ نئی لائبریری سے ملحق کافی ہاؤس کے قیام کی بھی خبریں ہیں۔ مگر کیسے معلوم ہو کہ یہ سب کچھ صحیح ہے یا غلط۔ یہ فرائض یونیورسٹی گزٹ کے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اس سلسلہ میں آئندہ اپنا کمال دکھائیگا۔

بسا اوقات ملک کے ذمہ دار اخباروں میں یونیورسٹی سے متعلق بڑی حیرت انگیز اور سنسنی خیز قسم کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ ہم منتظر رہتے ہیں کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران کی جانب سے تردید کی جائے مگر ایسا ہوتا ہی نہیں۔ مثال کے طور پر پچھلے سال ایک اخبار سے معلوم ہوا کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں زبردست اختلافات رونما ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ حقیقت نہیں ہاں کچھ حضرات کی خواہش تھی۔ یونیورسٹی کی طرف سے فوراً اس کی تردید شائع ہونی چاہئے تھی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ یونیورسٹی باہر کی دنیا سے مستقل تعلق رکھے۔ اور وقتاً فوقتاً یونیورسٹی کے حالات، نئے منصوبوں اور نئی تبدیلیوں سے ملک کے تمام افراد کو آگاہ کرتی رہے۔ اگر اہم اخبارات سے تعلق رکھا جائے تو دوسری یونیورسٹیوں کی طرح ہماری یونیورسٹی سے متعلق بھی NEWS LETTERS وغیرہ کی شکل میں خبریں شائع ہو سکتی ہیں۔ نشر و اشاعت کا شعبہ کافی عرصہ سے قائم ہے مگر اس کے وجود کی تصدیق کیسے ہو!

علی گڑھ میں ایک تو بارش بڑی حسرتوں کے بعد ہوتی ہے اور پھر دو چار بوندیں گری نہیں کہ ہر طرف تالاب کے تالاب نظر آنے لگے۔ سڑکوں کی طرف رُخ کیجئے تو کشتیوں کی ضرورت محسوس ہونے لگے۔ ہوسٹلوں، کمروں اور کلاسوں سے نکلئے تو تیراکی اور غوطہ زنی کے فنون کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے کیا پانی کے نکاس کا انتظام یہاں ممکن نہیں۔ بہت عرصہ ہوا سنا تھا کہ حکومت کی طرف سے کچھ رقم اسی غرض سے منظور کی گئی تھی۔ مگر معلوم نہیں بعد میں کیا ہوا۔

نالیوں میں پانی دیکھنے کے لئے جو چند نالے ہیں ان کی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے پہلے تو ایسا ہوا کرتا تھا کہ جب بھی نالوں میں پانی آیا محکمہ تعمیرات کی

(بقیہ صفحہ ۔۔ کالم ۲ پر)

۱۸۵۷ء کی اہمیت

(پروفیسر محمد مجیب)

سو برسوں میں کوئی راز تو پوشیدہ نہیں ہونا چاہئے۔ پھر بھی اس عرصہ میں جن نسلوں کے جمع کئے ہوئے تجربے کچھ دور ہوتے ہیں۔ اور یوں بھی ہندوستان کی تاریخ پچھلے چار سو سالوں میں صد سالہ یادگاروں میں گھومتی رہی ہے: ۱۵۵۵ء۔ پانی پت کی دوسری لڑائی اور سلطنت مغلیہ کا قیام؛ ۱۷۵۸ء تخت لیلیٰ کی جنگ میں اورنگزیب کی جیت جس نے مغلیہ سلطنت کی سوئی پیچھے کی طرف گھما دی اور جو مستقل طور پر ۱۷۰۷ء کا روپ اختیار کر گئی؛ ۱۷۵۷ء جنگ پلاسی اور انگریزی حکومت کا قیام؛ ۱۸۵۷ء۔ اس حکومت کے اٹھنے کی پہلی ناکام کوشش؛ ۱۹۴۷ء۔ اس کا پر امن استیصال۔

۱۸۵۷ء کے ہندوستان میں بنیادی بات اس دور کے یورپ کے مقابلہ میں اس کی پسماندگی ہے۔ یورپ کئی ایک ترقی پسند تجربوں کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔ نشاۃ ثانیہ، تجدید دین، سولھویں صدی کی سرمایہ دارانہ ترقی، انگلستان کا ۱۶۸۸ء کا انقلاب، ۱۷۸۹ء کا انقلاب فرانس، نپولین، یورپ میں نئی جمہوری ریاستوں کی تنظیم، صنعتی میدان میں انگلستان کی پیش قدمی اور عظیم الشان تجربہ کی تعمیر جو سمندروں کو فتح کر رہا تھا۔ ترقی کے اسی دھارے کی مختلف لہریں ہیں۔ اس وقت ہم ہندوستان میں قرون وسطیٰ کی ترقی کے معیاروں سے بھی گر چکے تھے۔ اور بیرونی دنیا سے قطعاً لاعلم تھے۔ بدلے حالات کا پوری طرح تجربہ کئے بغیر ایک زبردست طاقت کو چیلنج کیا ——— ایک ایسی طاقت کو جو حکومتی اور نوآبادیاتی معاملات میں اپنی سوجھ بوجھ پیدا اور دولت میں اپنی اہلیت کے لئے ساری مغربی طاقتوں پر سبقت لے گئی تھی۔ ہم ابھی اس تحریک میں سارے ہندوستان کو ساتھ نہ لا سکے، اور ہمارا یہ انقلاب عوامی اور وطن دوست ہونے کے باوجود ایک غیر منظم شورش سے آگے نہ بڑھ سکا۔

انقلاب کے بعد آنے والی دہائیوں میں ہندوستانیوں کو اتنی آزادی بھی نہ تھی کہ اس پر کچھ کہہ سکتے۔ لیکن انگریز عوام کو بیوقوف بناتے رہے۔ میری عمر کے لوگوں نے جن کی طفلی کی سیاسی بیداری اس صدی کے ابتدائی سالوں سے شروع ہوتی ہے۔ اپنے بزرگوں سے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی بربریت کی بہت سی دردناک کہانیاں سنی ہوں گی۔ یہ کوئی موقع نہیں ہے کہ میں ان کہانیوں کو یہاں دہراؤں لیکن یہ اس بات کی شہادت ضرور ہیں کہ اس انقلاب کے استحصال کے ساتھ ہی ظلم و تشدد کا ایک دور شروع ہوا۔ جو ہندوستانیوں میں سلنے والی آزادی کی ساری خواہشوں کو کچلنے کے لئے قصداً شروع کیا گیا تھا۔ اور جس نے اس بات کو واضح کر دیا کہ چاہے ہندوستانی اسے پسند کریں یا نہ کریں انگریز ان پر ابد تک مسلط رہیں گے۔ چنانچہ ان سیاسی مقاصد کی برآری کے لئے دو قطعاً غلط نظریئے پیش کئے گئے۔

(۱) پہلے انگریزوں کی اکثریت نے اس تحریک کو ایک سپاہیانہ بغاوت کہا تاکہ اس کے نام پر وہ کچل کے سزا دے سکیں۔ اور یہ صحیح بھی تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے پیچھے صرف ایک مقصد تھا اور وہ انگریزی راج کا استحصال۔ پھر جب بعد کے انگریز مورخوں نے ہندوستانی باغیوں کی آپس میں دیسی ریاستوں کے فرمانرواؤں سے اور خود انگریزوں سے ساز باز کو مشتہر کرنا شروع کیا تو وہ محض بازاری گپوں کے علاوہ کوئی جواز ثبوت فراہم نہ کرسکے۔

(۲) لیکن اس نظریہ میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ اس نے بغاوت کی وجہ انگریزی راج کی غیر مقبولیت کو قرار دیا اور نتیجتاً بیہمانہ مظالم کے لئے دروازے کھول دیئے جبکہ انقلاب کے بعد کے سالوں میں اندرونی اور بین الاقوامی معاملات برطانوی پالیسی سے اس کے متقاضی تھے کہ برطانوی حکومت کی بنیادیں ہندوستانیوں کی پسندیدگی اور تسلیم و رضا پر جتنی ہو سکے جمائی جائیں۔ اسی لئے سر سید احمد خاں کی پیش کی ہوئی ایک تھیوری کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ اس عجیب تھیوری کے مطابق ۱۸۵۷ء کی تحریک خاص طور پر سپاہیوں کی شرارت تھی۔ جس کے لئے ہندوستان کے عوام کسی طرح ذمہ دار نہ تھے یہ حکومت اور اس کے ملازموں کے درمیان ایک قضیہ تھا جس میں ملازموں کو کافی سزا مل چکی تھی۔ اور اب کچھ اور کہنے یا کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ تھیوری ایک عرصہ تک اپنی عملی افادیت کے پیش نظر چلتی رہی۔ لیکن یہ سراسر لغو تھی۔ اور یہ بات سب سے پہلے اس کے مصنف کو معلوم تھی۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب ایک جبلی اور غیر منظم حرکت تھا۔ نہ ان لوگوں کی کارگزاری تھی جو برے برتاؤ سے حق تلفی اور مایوسی کا شکار ہو رہے تھے۔ اس میں ہر اس چیز کی کمی تھی جو ایک مقصد کامیاب انقلاب میں ہونی چاہئے۔ پہلے سے کچھ بھی نہیں سوچا گیا تھا۔ نہ پہلے سے کسی آنے والے خطرے کے لئے کوئی انتظام کیا گیا تھا بے سوچے سمجھے اس بات کی کوشش کی گئی کہ تین مردہ سیاسی نظاموں کو پھر سے زندہ کیا جائے۔ دہلی میں سلطنت مغلیہ، لکھنؤ میں دربار اودھ اور کانپور میں پیشوا گری ——— ۱۸۵۷ء کے انقلابی ان دو بنیادی باتوں کو بھی پورا نہ کر سکے۔ جن پر ہر دور کے انقلابی زور دیتے رہے ہیں۔ وہ نہ تو سختی سے امن و امان ہی قائم رکھ سکے اور نہ فوجیوں کو گزر اوقات کے قابل تنخواہیں دے سکے۔ اور ظاہر ہے ان کے پاس ہتھیاروں کے بنانے کا بھی کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا۔ میں نے بچپن میں سنا تھا کہ لکھنؤ کے شہدوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ انقلاب میں حصہ لیں گے لیکن ان کے پاس لڑنے کو کچھ نہ تھا کسی طرح ان کے ہاتھ ایک توپ لگ گئی۔ لیکن اس کے لئے نہ تو گولے تھے نہ بارود کا مسالہ اس لئے انہوں نے آتشبازی کی بارود بنائی اور اس کی مدد سے رنڈیوں کو داغتے رہے۔

قرون وسطیٰ میں انتظامی امور میں ہندوستانیوں کی صلاحیت ترقی کی آخری منزلوں تک پہنچ گئی تھی اور ان کا اس میدان میں چین کے علاوہ کوئی ہمسر نہیں تھا۔ لیکن اورنگزیب کے انتقال کے بعد کئی نسلوں میں یہ انتظامی صلاحیت قطعاً مفقود ہو چکی تھی۔ وہاں کوئی پڑھے لکھے متوسط خاندان نہیں تھے جو رائے عامہ کو تربیت دے سکیں یا اسے متاثر کر سکیں۔ پرانے تعلیمی ادارے آؤٹ آف ڈیٹ تھے۔ اور جو کچھ وہ پڑھا رہے تھے اس کی ۱۸۵۷ء میں کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ اس عہد کی جہالت کی ایک اچھی مثال ہے کہ سر سید احمد خاں جیسے شخص نے ایک کتاب یہ ثابت کرنے کے لئے لکھی تھی کہ زمین چپٹی ہے۔ رائے عامہ کے اس فقدان، عوام کی بے سوچے سمجھے عاجلانہ فیصلوں اور ناعاقبت اندیشی نے اس تحریک کو بری طرح تباہ کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ اس انقلاب میں کوئی بڑا رہنما سامنے نہیں آیا۔ اس عہد کے سیاسی دستوروں کے مطابق شاہی خاندانوں کے علاوہ کسی کو قابل تقلید بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ خاندان زوال پذیر ہو گئے تھے۔ انقلابیوں کو جیٹ یوسی کا

سامنا کرنا پڑا تو انہیں اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نظر نہیں آیا کہ وہ امرا اور ریاستوں کے فرمانرواؤں کی مدد لیں۔ لیکن ان بڑے فرمانرواؤں میں ایک بھی مدد کے لئے نہیں نکلا۔ اس لئے جھانسی کی رانی، نانا صاحب اور کنور سنگھ آروی جیسے چھوٹے اور ثانوی فرمانروا ہی تمام تعریف کے مستحق ہیں جنہوں نے اس بغاوت میں پوری طرح حصہ لیا تھا۔ موجودہ معلومات کی روسے یہ چیزیں ثابت ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کے تعلقات برٹش سرکار سے کشیدہ ہوچکے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں کو جرائم سے بھی آلودہ نہیں کیا تھا اور جس وقت انہوں نے انقلاب میں شرکت کی تو ان کے پیش نظر کوئی ذاتی مفاد یا مقاصد نہیں تھے۔ وہ صرف حق کی راہ میں موت تلاش کرنے کے لئے نکلے تھے۔ ان کی یاد عیب جو نقادوں کی نکتہ چینیوں کے باوجود ہندوستانیوں کے دلوں میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ تحریک کے دوسرے عوامی لیڈر مثلاً مولینا عبداللہ تاتیہ ٹوپی، عظیم اللہ، برکت احمد وغیرہ بہادر اور جرأت مند لوگ تھے۔ انہوں نے کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اور یہ صحیح معنوں میں غیرتشنیں ہیرو تھے۔ لیکن وہ صرف ایک ثانوی اول جیسے اس وقت کی رائے عامہ تو ادا کرسکتی تھی ادا کر کے ہی مطمئن ہوچکے۔ جہاں تک لکھنؤ اور دہلی کے شاہی خاندانوں کا تعلق ہے انھیں اس انقلاب میں حصہ لینے والوں میں کوئی ممتاز مقام ہرگز نہیں ملنا چاہئے۔ ایسے وقت میں بھی جبکہ حالات کسی جدوجہد کا، اکبر یا شیواجی کا مطالبہ کر رہے تھے ہندوستانی اپنے آپ کو کسی ایسے کل ہند رہنما کو تسلیم کرنے پر آمادہ کرسکے جو ان زوال پذیر شاہی خاندانوں کا چشم و چراغ ہو۔

لیکن ان تمام نقائص کے باوجود ۱۸۵۷ء کی یہ تحریک صرف سپاہیوں کا غدر نہ تھی۔ یہ دراصل برٹش دہلی اور نواح میں رہنے والے تمام عوام کی ایک متحدہ بغاوت تھی۔ اگر برطانوی سرکار کا مقابلہ صرف سپاہیوں کے غدر سے ہوتا تو وہ اسے فرو کرنے میں بڑی جلد کامیاب ہوجاتی۔ اس کی مشکلات اس وقت بڑھیں جب ان سپاہیوں کے ساتھ ہزاروں عوام بھی بغاوت میں شریک ہوگئے اور کچھ دن کے لئے شمالی ہندوستان میں انگریزی حکومت کی ساری عمارت زمین پر آرہی۔ جان مارشمن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اودھ میں ساری آبادی مسلح ہوگئی تھی۔ ہر گاؤں ایک قلعہ تھا۔ اور ہر شخص کا ہاتھ ہمارے خلاف تھا۔۔۔۔۔

جہاں تک اودھ کا تعلق ہے ہمیں ایک منظم قومی بغاوت کا مقابلہ کرنا ہے۔" ان ۸۰ ہزار لوگوں میں سے جو لکھنؤ ریذیڈنسی کا محاصرہ کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے تھے تقریباً آدھے کسان تھے اور اس لئے فصلیں بونے کا موسم شروع ہوتے ہوئے وہ چھوڑ کر چلے گئے۔

۱۸۵۷ء میں برطانوی نظام کے استحصال کا بھوت ہر بچے عورت اور مرد کے ذہن پر سوار تھا، چاہے یہ استحصال چند دن کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ سر سید احمد خاں تک نے بجنور کی بغاوت میں یہ تسلیم کیا ہے کہ اس ضلع میں برطانوی حکومت پوری طرح دم توڑ چکی تھی۔ کچھ سرکاری افسر باغیوں کا ساتھ دینے لگے تھے اور ان سرکاری ملازموں کے علاوہ جو اپنی نوکریوں کے متمنی تھے آبادی کا کوئی حصہ سرکار کا وفادار نہیں تھا۔ لیکن بعد میں ایک تھیوری بنائی گئی جس۔۔۔ اس بغاوت کو کچھ چند مخصوص مرکزوں میں محدود کردیا گیا۔ اور ساری کی ساری لڑائی میں کام آنے والے سپاہیوں اور کچھ لیڈروں پر ڈال دی گئی لیکن یہ سب مصنوعی تاریخ ہے جس کا حقائق سے کوئی علاقہ نہیں۔

پھر سپاہیوں کی آخر کیا اہمیت ہے؟ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی صدی میں ان سپاہیوں نے جو اپنے آقاؤں کے نمک حلال تھے بہ پوری پوری وفاداری کا ثبوت دیا تھا۔ ہر ہندوستانی فرمانروا نے ان کے حملے کے زخموں کو محسوس کیا تھا اور ان کے آگے سرنگوں ہوچکے تھے لیکن ۱۸۵۶ء میں اودھ کے پرامن الحاق کے بعد انگریز حکام اس نتیجہ پر پہنچے کہ سپاہیوں کا کام ختم ہوچکا ہے۔ اور انہیں اپنی اپنی جگہ پر رکھنا چاہئے۔ ان میں کوئی سازش نہیں تھی۔ اور سپاہیوں میں کسی سازش کا کبھی کوئی امکان نہ تھا۔ وہ انگریز حکام کی سخت نگرانی میں رہتے تھے اور سازش کا کوئی شائبہ بھی انگریزوں کی نظر سے چھپ نہیں سکتا تھا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ سپاہیوں نے کوئی بغاوت نہیں کی تھی، دراصل انھیں مجبور کیا گیا تھا۔ سارے انگریز افسر جانتے تھے کہ فوج کس طرح ان کے قبضہ سے نکل گئی ہے۔ اور انہوں نے عہد کرلیا تھا کہ وہ انھیں حسب حال سبق دیں گے۔ تجربے کے طور پر انھیں چربی لگی ہوئی گولیاں دی گئیں جن کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ سور کی چربی ہے اور اب تاریخی شواہد سے ثابت ہوچکا ہے کہ یہ گائے کی چربی تھی۔ جن فوجیوں نے ان کو استعمال کرنے سے انکار کردیا انھیں دس دس سال کی سخت سزائیں دی گئیں۔ لیکن اس ظلم و تشدد میں برطانوی حکام یہ بھول گئے کہ سپاہی سارے ملک میں ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ اور اس رشتہ کو وہ خود ایک صدی سے مضبوط کرتے رہے ہیں۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ناگزیر تھا۔ ایک ایسا انقلاب جس کی قیادت اچھے پڑھے لکھے شہریوں سے فوجیوں کی طرف بڑھنا چاہئے۔ جو انقلاب اس کے برعکس چلتا ہے۔ اس کی ناکامی طے شدہ ہے۔ جب ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے فوجیوں نے دہلی مارچ کرنے کا قصد کیا تھا تو انہیں دو اٹل حقیقتوں کو تسلیم کرنا پڑا تھا۔ ایک یہ کہ ان کے پاس انقلاب کی ایک سول عدالت ہونی چاہئے، دوسرے یہ کہ ان کی گزراوقات اور ماہ بماہ تنخواہ کے سارے سہارے ٹوٹ چکے ہیں۔ وہ کوئی پڑھے لکھے لوگ نہ تھے، ان کی بڑی تعداد اگرچہ شریف النفس تھی لیکن محنت کشوں کے ادبی خاندانوں سے تعلق رکھتی تھی۔ باقی حصہ پرانے نام پڑھے لکھے خاندانوں سے آیا تھا۔ ان میں کوئی ایک بھی ماہر افسر نہ تھا ــــــ فوجی نظم و نسق جسے انگریزوں نے ان پر زبردستی لادا تھا دھوئیں کی طرح غائب ہوگیا۔ اگر کسی شہری حاکم نے ان کی پچھلی تنخواہوں کا نصف دیکر ہی انھیں اور ان کے خاندانوں کو بچالیا ہوتا تو وہ اس کے پوری طرح وفادار ثابت ہوتے۔ لیکن ایسی کوئی تنظیم نہیں تھی اور انھیں اس کا خود ہی انتظام کرنا پڑا۔ پہلے انہوں نے سرکاری خزانوں کو لوٹا، پھر امیروں کو اور انھیں جن سے انھیں کچھ مل سکتا تھا۔ ان کے فوجی کارنامے مشکل انگیز تھے۔ ان میں جنرل شپ سرے سے مفقود تھی۔ لیکن سب مانتے ہیں کہ جب ان کا وقت آیا تو انہوں نے بہادری اور شجاعت سے جان دی۔ ان میں سے بہتوں کو توپ دم کردیا گیا۔ دوسروں کو اذیت ناک موت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور وہ دہائی نہ شور و غل مچایا۔ وہ جانتے تھے کہ آزادی کے طلبگاروں کی کیا سزا ہوتی ہے۔

(باقی صفحہ ۲ کالم ۱)

(... علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع ہوا)